(۱۱)

خواجہ صاحب کا تصورِ عشق

کسی نے کیا خوب کہا ہے

عشق می گویم و جاں میدہم از لذتِ وے

خواجہ صاحب کے ہاں عشق کی یہ لذت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ عشق کو خدا اور خدا کو عشق سمجھتے تھے اور بقول بابا فرید الدین گنج شکر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ "عشق ایک آگ ہے جو درویش کے دل کے سوا اور کہیں نہیں ہوتی"۔ اس آگ کو انہوں نے پھولوں کی سیج سمجھا اور اس سے خوب لطف اندوز ہوئے چنانچہ کہتے ہیں۔

قسم خدا دی قسم نبی دی عشق ہے چیز لذیذ عجیب

ترجمہ:۔ خدا اور نبی کی قسم عشق عجیب لذیذ چیز ہے۔

عشق کی یہ لذت ہی ہے جو انسان دکھ درد کو سہہ لیتا ہے

لکھ لکھ سول ہزاراں ڈوکھڑے سو سو شکر جو آئم پو کھڑے

بیشک ضرب حبیب نہ بیب

ترجمہ:۔ محبت میں اگرچہ لاکھوں درد اور ہزاروں دکھ ہیں۔ مگر میں شکر کے سو سو سجدے بجالاتا ہوں کہ یہ درد و غم قسام ازل نے میری قسمت میں ودیعت

Scanned with CamScanner

کر دیئے ہیں اور مجھے دوست کی مار بھی خوشگوار معلوم ہوتی ہے

ایک مقام پر قرآن مجید میں آیا ہے کہ "ہم نے اپنی امانت کو سارے آسمان، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اسے اٹھا لیا" اہل تصوف کے نزدیک اس آیت میں جس امانت کا ذکر کیا گیا ہے وہ عبادت، طاعت اور معرفتِ حق ہے جو عشق کے بغیر ممکن نہیں اور یہ انسان کی بلند ہمتی کی دلیل ہے کہ اس نے اس بارِ امانت کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا لیا۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

اس گراں بار ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے عشق کی مے تند سے آشنا ہونے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا صوفیائے کرام مردِ میدان بن کر سامنے آئے اور انہوں نے شرابِ عشق کے تند و تلخ گھونٹ بخوشی گوارا کر لئے۔

خم گردوں کو تک جس کا نہ یارائے تحمل تھا
وہی صہبائے تُندِ خُم شکن ہم کو پلا دی ہے

اس خم شکن صہبائے تند کا نشہ خواجہ صاحب کے ان اشعار میں ملاحظہ فرمایئے۔

دستوں پیر مغاں دے پیتم عشق دا جام

ترجمہ: میں نے پیر مغاں کے ہاتھ سے عشق کی شراب کا پیالہ پیا ہے۔

Scanned with CamScanner

خواجہ غلام فرید

وحدت کیتا غلبہ — بھول گیا کفر اسلام

ترجمہ:۔ توحید باری تعالیٰ نے اس قدر مجھ پر غلبہ کیا ہے کہ کفر اور اسلام فراموش ہو گئے ہیں۔

گذرے فرض فریضے — سنت کو بھی سلام

ترجمہ:۔ فرض اور فریضے تو ختم ہوئے ہی تھے۔ سنت کو بھی ہمارا سلام ہے

یہ نشہ محض عشق کا ہی نہیں عشق حقیقی کا ہے جو تمام اغراض و مقاصد اور احتمالات و شبہات سے مبرا و منزہ ہے۔ اس درجے پر پہنچنے کے بعد انسان کو پھر تو وحدت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ دوئی کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ دوست دشمن کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ بس محبت ہی ہر سو جلوہ ریز ہوتی ہے اس مقام پر پہنچ کر سالک انا الحق کا نعرہ لگاتا ہے۔ چنانچہ خواجہ فریدالدین عطار فرماتے ہیں۔

من غلام من غلام من خدا — ما ز غم از کبر و کینہ وز ہوا

خواجہ غلام فرید بھی اس مئے عشق سے سرشار تھے۔ دیکھئے کیا قلندرانہ بات کہی ہے۔

اساں سوہنے مست قلندر ہوں — کدیں مسجد ہوں کدیں مندر ہوں

ترجمہ:۔ ہم اس قدر مست اور قلندرانہ مسلک میں مدہوش ہیں کہ ہمارے سامنے اچھے برے کا فرق اٹھ گیا ہے۔ مسجد ہو یا مندر ہم ہر جگہ اسی کی قدرت کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

جن کا خمیر مہر و محبت سے اٹھا ہو۔ ان کے نزدیک مسجد اور مندر کی کوئی

Scanned with CamScanner

تمیز نہیں ہوتی۔ وہ دوزخ اور جنت کے قضیئے سے بھی آزاد ہوتا ہے
حکیم عمر خیام نے ذیل کی رباعی میں اسی فلسفے کو بیان کیا ہے۔

ہر کس کہ درد مہر و محبت بہ سرشت　　گر ساکن مسجد و در اہل کنشت
در دفتر عشق نام ہر کس کہ نوشت　　آزاد دوزخ است و فارغ ز بہشت

خواجہ صاحب کا نام بھی عشق و محبت کے دفتر میں درج تھا جبھی تو کہتے ہیں

کتھاں صومعہ دیر کنشت کتھاں　　کتھے دوزخ باغ بہشت کتھاں
کتھے عاصی نیک سرشت کتھاں　　کتھے گمرہ ہوں کتھے رہبر ہوں

ترجمہ:۔ ہماری قلندرانہ نگاہیں خانقاہوں، بتخانوں، گرجوں اور دوزخ و بہشت میں اسی کا دستِ قدرت دیکھتی ہیں۔ اسی طرح گنہگار۔ نیکو کار۔ گمراہ اور رہنما میں بھی ایک ہی جلوہ ہے۔ یعنی کبھی ہم اس رنگ میں نظر آتے ہیں اور کبھی دوسرے رنگ میں پائے جاتے ہیں۔

اطباء "عشق کو" النوع من المجنون" کہتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ خیال عشق باطل کے سلسلہ میں ہے جو جسم کثیف سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک عشق حقیقی کا تعلق ہے وہ ایک ایسے جذبۂ لطیف کا مظہر ہوتا ہے۔ جس میں خد و خال اور لب و رخسار پر نظر نہیں ہوتی۔

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد
کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگار لیست

خواجہ صاحب اسی جذبۂ لطیف کے قائل تھے اور اسی کو حصول مراد کا

Scanned with CamScanner

ذریعہ سمجھتے تھے۔ دیکھئے اس کافی میں اسرار و رموز کے کیسے کیسے دفتر کھول کر رکھ دیئے ہیں۔

بن یار سانول ہیو کو نہیں　　ہذا جنون العاشقیں
بے او نہ آنت و نہ ایں　　ہذا جنون العاشقیں

ترجمہ:۔ محبوب حقیقی کے سوا اور کوئی مطمح نظر نہیں یہ عشاق کا جنون ہے۔ اس کے بغیر "آں" اور "ایں" کچھ نہیں یعنی ماسوا اللہ کسی چیز پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ یہ عشاق کا جنوں ہے۔

عشق حقیقی کی نشانی یہی ہے کہ عاشق کو سوائے ذاتِ حقہ کے کچھ نظر نہیں آتا۔ اور وہ علی الاعلان پکار اٹھتا ہے۔

بخدا غیر خدا در دو جہاں چیزے نیست

خواجہ صاحب اس مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کیا نار کیا گلزار وے　　کیا یار کیا اغیار وے
او را بداں او را ببیں　　ہذا جنون العاشقیں

ترجمہ:۔ نار و گلزار۔ یار و اغیار سب میں اسی کا ظہور ہے تو اسی کی طرف دیکھ اور اسی کا ہو رہ۔ یہی تو جنونِ عشاق ہے۔

جب عاشق اس جذبے سے پوری طرح سرشار ہو جاتا ہے تو اس پر انوار الٰہی کی بارش ہونے لگتی ہے۔ اور اس کا دل عرش بریں بن جاتا ہے

واہ عشق ڈتڑی ڈات ہے　　تھئی رات سبھ پر بھات ہے

Scanned with CamScanner

شد فرشِ دلِ عرشِ بریں ہذا جنون العاشقیں

ترجمہ: عشق نے کیسی عنایت کی ہے کہ تمام رات اس خاکی دل میں تجلیات الٰہی کا دور دورہ ہوتا رہتا ہے۔ گویا یہ عرشِ بریں بن جاتا ہے۔ اور اس شغل میں صبح ہو جاتی ہے۔ یہ جنون عشاق کا ایک منظر ہے۔

دراصل تصوف مذہب عشق کا ہی دوسرا نام ہے۔ صوفیا جب طالب کو تزکیۂ نفس کی تعلیم دیتے ہیں تو سب سے پہلے عشق و محبت کا درس دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسی صیقل ہے جو تمام زنگوں کو صاف کر دیتی ہے۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد
کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

اسی نظریئے کے ماتحت خواجہ صاحب عشق کو اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں اور اس باب میں کسی زاہد خشک یا ناصح مشفق کی پروا نہیں کرتے۔

ناصح ناہی ناتھی مانع عشق اساڈا دین ایمان

ترجمہ: اے ناصح مجھے مت روک۔ عشق ہمارا دین و ایمان ہے۔

علم و عرفان کا دفتر۔ فقر و درویشی کے رموز اور پریم نگر کا راستہ بھی عشق ہی کی بدولت معلوم ہوتا ہے۔

عشق ہے رہبر راہ فقر دا
عشق ہے ہادی پریم نگر دا
عشقوں حاصل ہے عرفان

Scanned with CamScanner

خواجہ صاحب عشق کی فضیلت اس حدیث قدسی سے بھی ثابت کرتے ہیں۔

کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببتُ ان اعرف فخلقتُ الخلقَ

یعنی خدا کہتا ہے کہ میں ایک خزانہ مخفی تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں اس لئے مخلوق کو پیدا کیا۔

کُنتُ کنزاً عشق گراہی پہلوں جب خود ذات کوں آہی
جیں سانگھے تھیا جمل جہاں

مطلب یہ ہے کہ عشق ایسی ارفع و اعلیٰ چیز ہے جس کا اظہار پہلے پہل خدا کی طرف سے ہوا اور اس نے اپنے جمال و جلال کے نمود کے لئے جہان کو پیدا کیا۔

خواجہ صاحب نے عشق کی منزلت کو طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ اسی جذبے سے انسان اور حیوان میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر کسی میں عشق کا جذبہ نہ ہو تو وہ حیوان ہے۔

باجھ محبت جان برابر کیا ناطق کیا ناہق صاہل

ترجمہ:۔ محبت کے بغیر انسان اور گدھے برابر ہیں۔

میر لقی میر مثنوی "دریائے عشق" میں لکھتے ہیں

کچھ حقیقت نہ پوچھ کیا ہے عشق حق اگر سمجھو خدا ہے عشق
عشق ہے عشق ہے نہیں ہر کچھ عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں ہے محمدؐ کہیں علیؓ ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

Scanned with CamScanner

عشق کی یہی جلوہ فرمائی خواجہ صاحب کے ہاں ملاحظہ ہو۔

ہے عشق دا جلوہ ہر ہر جا　　سبحان اللہ سبحان اللہ
خود عاشق خود معشوق بنیا　　سبحان اللہ سبحان اللہ

ترجمہ:۔ ہر جگہ عشق کا جلوہ ہے۔ عاشق اور معشوق دونوں کے روپ میں عشق ہی ہے۔ سبحان اللہ کیا شانِ عشق ہے۔

خود بلبل تے پروانہ ہے　　گل شمع اوتے دیوانہ ہے
تھی چاند چکور نوں موہ لیا　　سبحان اللہ سبحان اللہ

ترجمہ:۔ خود ہی بلبل۔ پروانے اور چکور میں جلوہ فگن ہے۔ اور خود ہی معشوق گل۔ شمع اور چاند میں موجود ہے۔ سبحان اللہ

کدیں موسیٰ تھی میقات چڑھے　　ول وعظ کرے توریت پڑھے
کدیں عیسےٰ، یحییٰ، ذکریا　　سبحان اللہ، سبحان اللہ

ترجمہ:۔ کبھی موسیٰ علیہ السلام کی صورت میں حضرتِ عشق میقات پر کلامِ الٰہی سے شرف یاب ہوتے ہیں۔ اور کبھی توریت کا وعظ فرماتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ۔ یحییٰ اور ذکریا علیہم السلام میں بھی اسی عشق کا جلوہ ہے۔

کتھے راز انا الحق فاش تھیا　　کتھے سبحانی دا ورد پڑھیا
کتھے انی عبد رسول کہیا　　سبحان اللہ، سبحان اللہ

ترجمہ:۔ جوشِ عشق میں کہیں منصور کی زبان سے انا الحق نکلتا ہے۔ کہیں بایزید بسطامی سبحانی ما اعظم شانی کا ورد کرتے ہیں اور کہیں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم انی عبداللہ رسولہ کا اقرار فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ! کیا

Scanned with CamScanner

عشق کی شان ہے۔

عشق کے مختلف مظاہر کا بیان کرنے کے بعد خواجہ صاحب اہل صفا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ زندگی میں جب تک درد اور سوز نہ ہو جینے کا مزا نہیں۔

ہے پیت فرید دی ریت عجب ہے درد تے سوز دی گیت عجب
سن سمجھو سارے اہل صفا سبحان اللہ سبحان اللہ

ترجمہ:۔ اے اہل صفا یہ سن لو اور سمجھ لو کہ فرید کا شغلِ زندگی محبت سوز اور درد ہے سبحان اللہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔

علامہ اقبال کا یہ شعر بھی اسی فلسفہ کا آئینہ دار ہے۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

خواجہ صاحب اس سوز دمبدم کو زندگی کی خوشیوں کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ عشق ہی ہے جو ایک مرشد کی طرح مرید کو دنیا کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے۔

عشق ہے ڈکھڑے دل دی شادی عشق ہے رہبر مرشد ہادی
عشق ہے ساڈا پیر جیں کل راز سمجھایا

وہ علم و عمل میں بھی سوز عشق کے قائل تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ظاہری عبادات اور علم دین کا اسی وقت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے جب انسان کے دل میں خدا کی سچی محبت ہو۔ یہ الفاظ دیگر وجد و حال کی دنیا علم

Scanned with CamScanner

عمل کی دنیا سے افضل ہے

جداں عشق فریدا ستاد تھیا — سب علم و عمل برباد تھیا
پر حضرت دل آباد تھیا — سو وجد کنوں لکھ حال کنوں

ترجمہ :۔ اے فرید جب ہم نے عشق کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا تو علم و عمل کا تمام شغل برباد ہو گیا۔ لیکن یہ بات باعثِ تسکین ہے کہ دل کی بستی وجد و حال سے آباد ہے۔

علامہ اقبال اسی عشق کے متعلق فرماتے ہیں۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

خواجہ صاحب عشق کی اس حقیقت سے محض واقف ہی نہیں۔ بلکہ اسے فقر و درویشی کا راس المال سمجھتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

نیہہ فرید فقر دی موڑی — باجھ بریوں دے کل گل کوڑی
مردیں جیندیں نیویں پوری — دل توں داغ نہ لاویں کمے

ترجمہ :۔ عشق و محبت فقر و درویشی کا راس المال (سرمایہ) ہے بغیر عشق و محبت کے دنیا کی تمام باتیں جھوٹی ہیں اس محبت کو جیتے جی بلکہ مر کر بھی نبھانا اور اسے ایک لمحے کے لئے بھی ترک کر کے دل کو داغ نہ لگانا۔

Scanned with CamScanner

11/(11)

خواجہ صاحب پر دوسرے شعراء کا اثر

اول اول ہر صاحبِ کمال اپنے پیشروؤں کے نقوش پا کو مشعلِ ہدایت بناتا ہے۔ لیکن جوں جوں اس کی اپنی صلاحیتیں بروئے کار آنے لگتی ہیں وہ پرانی راہوں کو چھوڑ کر اپنے لئے نیا راستہ بناتا جاتا ہے۔ یہی راستہ پھر دوسرے آنے والوں کی راہنمائی کرتا ہے اور اس طرح چراغ سے چراغ جلنے کی روایت مسلسل قائم رہتی ہے۔

خواجہ غلام فریدؒ نے جب میدانِ سخن میں قدم رکھا تو ان کے سامنے اپنی زبان کے شعراء کا اندوختۂ سخن بھی تھا اور دوسری زبانوں کے سرمایۂ شاعری کے نمونے بھی تھے۔ ملتانی شعراء میں بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ علی حیدر ملتانی حافظ جمال۔ خواجہ حسن گامن۔ عبدالحکیم اوچی اور مولوی لطف علی کا کلام زبان زد تھا۔ سندھ پر شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کی شاعری کا اعجاز چھایا ہوا تھا۔ پنجاب میں شاہ حسین اور بلھے شاہ کے الاپے ہوئے نغمے گونج رہے تھے سرحد خوشحال خان خٹک کے جگائے ہوئے جادو سے مسحور تھا اور جن علاقوں میں اردو بولی جاتی تھی وہاں نظیر اکبرآبادی۔ میر تقی میر۔ خواجہ میر درد۔ حکیم مومن خان مرزا غالب اور استاد ذوق جیسے باکمال شعراء کے رنگ برنگ اور

Scanned with CamScanner

12/(11)

جیتے جاگتے نقوش لوگوں کو دیوانہ بنائے ہوئے تھے۔

خواجہ غلام فریدؒ اگر سطحی قسم کے شاعر ہوتے تو وہ ان میں سے کسی کا بھی رنگ اختیار کر سکتے تھے، لیکن چونکہ وہ غیر معمولی ذہن و فہم کے مالک تھے اس لئے انہوں نے ان سب سے استفادہ تو کیا لیکن کسی کے رنگ میں نہیں رنگے گئے۔ ابتداً ملتانی زبان کے شعراء میں مولوی لطف علی کا کلام اور سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کا کلام انہیں بہت مرغوب تھا۔ بعض سندھی روایات کے مطابق شاہ بھٹائی کا کلام ہی خواجہ صاحب کی شعر گوئی کی تحریک کا باعث ہوا اور انہوں نے اس اثر کے تحت سندھی زبان میں اشعار کہنے شروع کئے۔ چنانچہ میر حسان الحیدری سہروردی "تذکرہ لطفی" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ عین عالم شباب میں خواجہ فریدؒ شاہ بھٹائی کا کلام اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے اس مطالعہ نے خواجہ فریدؒ کے دل میں نئی امنگیں اور نئے جذبات بھی پیدا کئے محبت کے خوابیدہ جذبات کے بیدار ہو جانے سے ان کے دل میں شعر گوئی کے لئے ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ ان کے ابتدائی کلام کا اکثر حصہ سندھی زبان میں تھا جو مرور ایام سے تمام تر ضائع ہو گیا اس کے باوجود فریدؒ کا جو تھوڑا بہت سندھی کلام ملتا ہے اس سے شاہ لطیف کا رنگ ظاہر ہے"

(ماہ نو۔ کراچی۔ جولائی ۱۹۶۲ء)

شاہ بھٹائی کے علاوہ سندھ کے سچل سرمست کا رنگ بھی خواجہ صاحب

Scanned with CamScanner

نے ضرور قبول کیا ہوگا۔ کیونکہ "منصوری روش" کی تبلیغ میں وہ خواجہ صاحب کے پیشرو تھے۔ میر حسان الحیدری اس اتباع کو سچل سرمست سے خواجہ صاحب کے نسبی تعلق اور وطنی قربت کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ خواجہ صاحب کا وطن سندھ سے بہت متصل ہے اس لئے خواجہ صاحب کے کانوں تک سچل سرمست کا کلام ضرور پہنچا ہوگا۔ بہاولپوری روایت کی رو سے مولوی لطف علی کی مثنوی سیف الملوک جو اس زمانہ میں بیحد مقبول تھی خواجہ صاحب کی شعری صلاحیتوں پر جلا کرنے کا سبب بنی۔ چنانچہ اس روایت کی تصدیق خواجہ صاحب کے اپنے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ دیوان فرید کے مقدمہ میں مقابیس المجالس کا یہ حوالہ درج ہے۔

"بعد ازاں حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالیٰ بقائہ فرمودہ اند کہ در ابتدا ایں سودا طالبان ایں راہ را مانند کلام سیفل کہ تصنیف لطف علی شاعر است دیگر ہیچ کلام پر ذوق در نظر نمے آید پس من در ابتدا حال یک یک جزو از سیفل در دو گھنٹہ یاد میکردم"

"سیفل" مثنوی سیف الملوک کا مخفف ہے یہ مثنوی نہ صرف اثر انگیزی۔ جذبات نگاری اور انداز بیان کے اعتبار سے بلند پایہ ہے بلکہ محاورہ بندی، صحت لفظی اور ادائیگی مطالب کے لحاظ سے لسانی زبان میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ خواجہ صاحب کا اپنی نوشتی کے زمانہ میں اسے حفظ کرنا اس کی مزید عظمت کی دلیل ہے لیکن یہ بات مذکورہ بالا روایت سے قطعی واضح ہو جاتی ہے کہ لطف علی کی سیف الملوک کے علاوہ

Scanned with CamScanner

کسی اور کا کلام ان کی نظر میں نہیں جچتا تھا ظاہر ہے جب ان کا ذوق مزید بلند ہوا ہوگا۔ تو سیف الملوک کی اثر انگیزی بھی زائل ہو گئی ہوگی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ کلی طور پر وہ نہ شاہ بھٹائی یا سچل سرمست سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اور نہ لطف علی کا رنگ ان پر غالب نظر آتا ہے۔ جزوی طور پر یقیناً ان کی شاعری میں تمام متقدمین خواہ وہ ملتانی ہوں یا سندھی پنجابی ہوں یا اہل اردو سب کا کچھ نہ کچھ اثر پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے کلام میں علم و حکمت کے جو چمکدار موتی دکھائی دیتے ہیں وہ بابا فرید کے تصرفات کا نتیجہ ہیں۔ عرفان و آگہی کے جو مقامات ملتے ہیں انہیں سندھ کے شاہ لطیف اور سچل سرمست سے استوار کیا جذب اور مستی کا رنگ پنجاب کے شاہ حسین اور وارث شاہ سے روحانی طور پر حاصل ہوا۔ سلاست زبان۔ محاورہ بندی اور منظر کشی کی جو لطافتیں ان کے حصہ میں آئی ہیں اس میں لطف علی کی سیف الملوک کا ہاتھ ہے۔

اردو شعراء کی بعض خوبیاں بھی ان کے کلام میں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً منظر نگاری کا جو کمال نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ملتا ہے اس کی جھلک خواجہ صاحب کے ہاں بھی نظر آتی ہے جس طرح نظیر اکبر آبادی منظر کے تمام اجزا و عناصر کو شعروں کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ ویسے ہی خواجہ صاحب جب کسی منظر کو منظوم کرتے ہیں۔ تو اس کے جملہ متعلقات کا بیان بھی شرح و بسط کے ساتھ کرتے ہیں خاص طور پر خواجہ صاحب کی کافیوں میں برکھا رت کا حال پڑھ کر نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم "کیا کیا مچی ہیں" یاد برسات کی بہاریں یاد آجاتی ہے۔ اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

خواجہ صاحب پر پوربی شعرا کا اثر

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ قطرات کی بہاریں ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر جو مست چھا رہے ہیں جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو خوش ہیں وہ خوشی میں کاٹے ہیں رات ساری جو غم میں ہیں انہوں پر گذرے ہے رات بھاری
سینوں سے لگ رہی ہیں جو ہیں پیا کی پیاری چھاتی پھٹے ہے انکی جو ہیں برہ کی ماری
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اب برہنوں کے اوپر ہے سخت بیقراری ہر بوند مارتی ہے سینے اوپر کٹاری
بدلی کی دیکھ صورت کہتی ہیں باری باری ہے ہے نہ لی چلائے انکی بھی سدھ ہماری
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اب خواجہ صاحب کی کافی کے یہ بند دیکھئے۔

آئے مست ڈہاڑے ساون دے
وہ ساون دے من بھاون دے
بدلے پورب ماڑ ڈکھن دے کجلے بھورے سو سو ون دے
چارے طرفوں زور پون دے سارے جوڑ وساون دے

ڈیہاں پینگھاں ساویاں پلیاں راتیں کھمنیاں گھمن رنگیلیاں

Scanned with CamScanner

گج گج گاجاں گجن رسیلیاں　　وقت سنگار سہاون دے

روہی راوے تھیاں گلزاراں　　نقل چتر انگ دی باغ بہاراں
گھنڈ تواراں بارش باراں　　چرچے دھانوں گانوں دے

چاندنی رات ملہاری ڈینہہ ہے　　ٹھنڈیاں ہیلاں رم جھم مینہ ہے
سوہنی موسم مگر انیہہ ہے　　گجنے ویلے غم کھاوں دے

ان میں برکھا رت کی وہ تمام تفصیلات موجود ہیں جو نظیر اکبرآبادی کے ہاں ملتی ہیں۔ لیکن اس یکسانیت کے باوجود دونوں میں ایک نمایاں فرق بھی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی حیثیت ایک تماشائی کی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے من وعن شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ صاحب اپنے منظر کے خود کردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار میں مشاہدات سے زیادہ احساسات و جذبات کی کارفرمائی ہے۔ اس کے علاوہ رجائیت جو ان کا خاص جوہر ہے ان شعروں سے بھی صاف عیاں ہے۔ وہ پُرکیف موسم کا ذکر کر کے اپنے زخموں کو ہرا نہیں کرتے۔ بلکہ دل کو یہ تسلی دیتے ہیں کہ ابھی غم و الم کا جو دور دورہ تھا وہ فصل بہاری کے صدقے میں ختم ہو جائیگا اور ہر طرف خوشی ہی خوشی کا تسلط ہوگا۔

نظیر اکبرآبادی کی ایک اور معرکتہ الآرا نظم جس کا مصرعہ ہے۔

Scanned with CamScanner

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارا

خواجہ صاحب کی اس کافی سے بہت مشابہ ہے

جیون ڈینہہ اڈھائی دو یار سٹ گھت فخر وڈائی دو یار

جس طرح خواجہ غلام فرید نے اس کافی میں ناپائیداری عالم اور دنیاوی تعلقات کی ناسازگاری کا نقشہ کھینچا ہے۔ اسی طرح نظیر اکبرآبادی کی نظم میں بھی دنیا کی بے ثباتی کا ہمہ جہتی اور بڑا پُر تاثیر جائزہ ملتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی نظم کے بعض بند یہ ہیں۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھوآں اور انگارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت نانی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری دھل جائے گی
اک بدھیا تیری مٹی پہ پھر گھاس نہ چرنے آئے گی

Scanned with CamScanner

یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جائے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آئے گی
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ نظم از اول تا آخر بڑے تاثر کی حامل ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد دنیا سے سخت نفرت ہوتی ہے۔

اب خواجہ صاحب کی کافی کے بھی کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

کتھ او پنگھیہ پیل ملکانے ناز حسن کتھ راج ببانے
کتھ ماں بہنیں بھائی دو یار
کتھ رانجھن کتھ کھیڑے بھیڑے کتھ رہ گئے اوہ جھگڑے جھیڑے
کتھ چوچک دی جائی دو یار
ماہی منجھیاں بھیڑ سلیٹی عطروں بھنڑی مشک لپیٹی
گئے سب جھوک لڈائی دو یار

یہ کافی دنیائے فانی کا مظہر ہونے کے باوجود یاس و قنوط کی محرک نہیں بلکہ اس کے چند بند پڑھنے کے بعد ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب لوگوں کو دنیا سے بیزار نہیں کرنا چاہتے بلکہ تصویر کا تاریک رخ دکھا کر انہیں روشن رخ کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے چنانچہ کہتے ہیں۔

مچھلیں پنگیں لاسوں تاریں چنکیں گھنڈیں ہونگ تواریں
سبھوں راند رسائی دو یار

Scanned with CamScanner

(۱۹)

تھیاں سرسبز فریدا دیاں جھوکاں مہروں سبز تھیاں دل سوکھاں
بختیں دا گ ولائی ودیار

ان اشعار میں خواجہ صاحب اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ دیکھ آسمان پر رنگ برنگ کے بادلوں نے کیسا دلفریب سماں پیدا کر دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری قسمت کے دن پلٹنے والے ہیں۔

خواجہ صاحب کی اس رجائیت نے یہاں بھی انہیں نظیر اکبرآبادی سے ایک علیحدہ مقام دے دیا ہے۔ فی الحقیقت خواجہ صاحب میں بیک وقت اتنی خوبیاں جمع ہو گئیں ہیں کہ ایک نظر دیکھنے کے بعد تو انہیں ان کے کسی بھی پیشرو سے مشابہ کیا جا سکتا ہے لیکن جب مجموعی طور پر ان کے جملہ محاسن سامنے آتے ہیں تو ان کی شخصیت سب سے جدا اور انفرادی حیثیت کی حامل بن جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

20/(ii)

(مناظر فطرت)

روہی اور خواجہ غلام فریدؒ

ہر زبان کی شاعری اپنے ماحول کی ترجمان اور ان افکار و رجحانات کی حامل ہوتی ہے جن کا اس ماحول میں بسنے والوں سے قلبی و ذہنی تعلق ہوتا ہے جو شعراء حبِ وطن کے جذبے سے سرشار اور قومی روایات کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی وطنی خصوصیات پر فخر کرتے ہیں بلکہ ان کے تحفظ و بقا کے لئے بھی پورا زورِ کلام صرف کرتے ہیں۔

خواجہ غلام فرید کا شمار بھی انہی شعرائے کرام میں ہوتا ہے جنہیں دیارِ غیر کے گل و گلزار کے مقابلے میں اپنے وطن کے خار و خس زیادہ عزیز تھے۔ انہیں اس خطۂ زمین سے جہاں وہ پیدا ہوئے۔ پلے بڑھے اور پروان چڑھے، بے انتہا محبت تھی۔ وہاں کے بے آب و گیاہ صحرا۔ ٹوٹے پھوٹے پانی کے تالاب اور ریت کے شکستہ قلعے۔ جہاں لوگ خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے اور بھیڑ بکریاں پال کر گذر اوقات کرتے ہیں۔ بیحد پیارے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

سندھڑے رہن نہ ڈیندیاں لگڑیاں تانگھاں پل پل
روہی مینگھ ملہار ڈاں کھمدیاں کھمنیاں اج کل

Scanned with CamScanner

دلڑی سکدی دیس ڈوں اکھڑیں منجھوں بل بل
ویکھاں باغ بغو چڑے جیہڑا جانوم جل بل
لانٹے پھوگ فریدؔ دے درد دلیندے درل

سندھڑا سندھ کو کہتے ہیں جو دریائے سندھ کے کنارے کنارے آباد ہے اس سے ہٹ کر جو ایک سپاٹ علاقہ جیسلمیر اور بیکانیر کی سرحد تک چلا گیا ہے۔ روہی یا چولستان کہلاتا ہے۔ روہی ملتانی زبان میں پہاڑی کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس علاقے میں بے شمار چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ملتی ہیں۔ اس وجہ سے اس سارے علاقے کا نام روہی پڑ گیا ہے۔ یہ علاقہ صرف بارش کے دنوں میں آباد ہوتا ہے۔ یہاں کے رہنے والے پانی کی تلاش میں دور دور نکل جاتے ہیں۔ لیکن جونہی بارش کے آثار پیدا ہوئے انہوں نے پھر روہی کا رخ کیا۔ خواجہ صاحب نے مذکورہ بالا شعروں میں اسی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"جب میں وطن سے باہر ہوتا ہوں تو وطن کی یاد میں میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور سندھ کے باغ و بہار دیکھ کر مجھے اپنے وطن کے ریگستانی پودے (لانے اور پھوگ) یاد آجاتے ہیں۔ کیونکہ یہی تو میرے درد دل کا علاج ہیں۔"

روہی کے ان پودوں کو خواجہ صاحب ایک اور کافی میں اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

لانٹے پھوگ اساڈے مانٹے ٹبڑے ٹھبڑے ڈہر لکانٹے

Scanned with CamScanner

(۱۱) روہی اور خواجہ غلام فریدؒ

ڈسدے سکڑے کھیتر کمانڈے ساگی باغ ارم دے یار

ترجمہ:- روہی کے لانے اور پھوگ ہمارے لئے مایۂ افتخار ہیں اور یہاں کے ٹیلے۔ بھٹ اور ڈہر (میدان) ہمارے مسکن ہیں۔ سوکھے ہوئے اور کملائے ہوئے کھیت ہم کو سرسبز اور اصلی بہشت کا سا لطف دیتے ہیں

اس علاقے سے خواجہ غلام فریدؒ کی والہانہ محبت اور غیر معمولی دلچسپی کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ یہاں کی ایک دوشیزہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے۔ ان کا یہ رومان کافی دن جاری رہا۔ جس کی وجہ سے انہیں بارہا روہی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ ایک روایت کے مطابق وہ اٹھارہ سال تک یہاں کی ایک بستی میں مقیم رہے۔ ذیل کے شعروں سے اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے۔

پُر وحشت سنجڑی روہی
اے دل دیوانی موہی

تھی راہی برڈوں جلساں دل راہوں مول نہ ولساں
وِنج ساتھ پریندے رلساں وِچ روہی کرسوں پوہی

ترجمہ:- اس پر وحشت اور ویران روہی نے میرا دل موہ لیا ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اس کے دشوار گذار راستے طے کروں گا اور پھر وہاں پہنچ کر اپنے محبوب کے جلوؤں میں ایسا مبہوت ہوں گا کہ پھر کبھی واپس نہ آؤں گا۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ٹوبھہ بنواڈے پکا تڑ تاڑ تے — سندھڑوں دور اتاڑ تے
صبح سحوریں گھوبکن مٹیاں — جو ھپڑ دے اگواڑ تے
روہی راوے روہیں دھماں — ہوک پووے وچ ماڑ تے
پھلوڈھے تے منت لیسوں — تھوڑا چڑھیسوں دینے لاڑ تے

ترجمہ: اے دوست مجھے ریگستان میں کوئی پختہ موقع دیکھ کر ایک ٹوبھا بنوا دے جو سندھ سے بہت دور اور اتاڑ کے موقعہ پر ہو۔ ایسا موقعہ ہو جہاں صبح سویرے چھاچھ بلونے کی آوازیں جھونپڑوں کے صحن سے بلند ہوتی ہیں۔ ایسا ٹوبھہ ہو کہ روہی، راوے اور پہاڑوں تک اس کی دھوم ہو جائے اور ریگستان کیا راجپوتانے اور مارواڑ تک اس کی شہرت پہنچ جائے۔ ہم ریگستان میں چل کر پھلوڈہا اور دینے لاڑ پر اپنا احسان جتائیں گے۔

ڈھا اور لاڑ یہاں کے قبیلوں کے نام ہیں "پھلوڈھے" اور "دینے لاڑ" ان قبیلوں کے سردار تھے خواجہ صاحب کی منظور نظر بھی اسی قوم لاڑ کی دوشیزہ تھی (خواجہ صاحب کے اس رومان کا حال گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے) یہاں کے لوگوں کو خواجہ صاحب سے عقیدت ہو گئی تھی۔ پھلوڈہا ہمیشہ آپ کو یہاں آنے کی دعوت دیا کرتا تھا اور دینا لاڑ روہی میں آپ کے لنگر کا مہتمم تھا۔

اس واقعاتی پس منظر کو سامنے رکھ کر ان شعروں کا لطف اٹھایئے دیکھیے کس جذب و شوق کے ساتھ وہ اس ریگستان میں جہاں صبح صبح چھاچھ بلونے کی آوازیں آتی ہیں۔ مستقل رہائش کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اور یہ چاہتے ہیں کہ یہاں ایک ایسا تالاب بن جائے جہاں بارہ مہینے پانی بھرا رہے تاکہ کسی عالم میں بھی یہاں سے ترک سکونت کا خیال پیدا نہ ہو۔

خواجہ صاحب کو یہاں کے خوبصورت کھنڈر، تالابوں کے ٹوٹے ہوئے کنارے اور ریت کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اس قدر پیاری تھیں کہ وہ ان کی خاطر سفر کی تمام کلفتیں برداشت کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

سوہنیاں ٹھیٹریاں ٹبرے ٹھبرے　　ناز و والے گڈے وٹرے

باہیں ٹوبھے پاڑے گھنڑے　　ڈٹھریں ڈوکھڑا دوں ہے یار

ترجمہ:۔ ریگستان کے یہ خوبصورت کھنڈر، ٹیلے، بھٹ اور ناز آفرین وطن کے زرد رنگ کے ڈھیلے۔ وہاں کے نشیب، ٹوبھے، تالابوں کے ٹوٹے ہوئے کنارے اور گڑھے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھتے ہی سفر کی تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں۔

یہ ریگستانی علاقہ جو سابق ریاست بہاولپور کی حدود میں تقریباً ۱۲ ہزار مربع میل رقبہ پر مشتمل ہے کسی زمانہ میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ یہاں عالی شان عمارتیں اور مضبوط قلعے تھے۔ لوگوں کو آرام و آسائش کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ کاروباری اعتبار سے اس جگہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں دریائے سندھ سے مال و اسباب سے لدی ہوئی کشتیاں آتی تھیں اور یہاں سے خام مال لے کر بحیرۂ عرب کی طرف روانہ ہوتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ مغلوں کے ابتدائی دور تک یہ علاقہ مکمل طور پر آباد تھا۔ لیکن بعد میں سیلاب کی تباہ کاریوں نے اسے تہ و بالا کر دیا اور یہاں کی پر رونق اور گنجان بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں

Scanned with CamScanner

آج اس علاقے کی حیثیت ایک فراموش کردہ زمین سے زیادہ نہیں اب یہاں نہ رہنے کیلئے مکانات ہیں نہ پینے کے لئے پانی۔ نہ معیشت کے ذرائع ہیں۔ نہ وسل و رسائل کی سہولتیں۔ لوگ خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے اور پانی کی تلاش میں اپنے مال مویشیوں کو اپنے ساتھ لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرتے ہیں۔

جتھ نخلڑا' جتھ دربوں ہے یار　　اوتھ ہر ویلے لدبوں ہے یار

ترجمہ:۔ جہاں نخل اور دربوں (روہی کے مقامات) جیسے موقعے موجود ہیں۔ وہاں ہر وقت کوچ اور قیام کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

غرض یہ چلا چلی کا میلہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ آج یہاں سے سامان لادا اور دوسری جگہ جا پہنچے۔ کل وہاں سے کوچ کیا اور دوسری جگہ جہاں گھاس کا موقعہ نظر آیا جا ٹھہرے۔ عجیب بے سروسامانی کی زندگی ہے۔ خواجہ صاحب یہاں کی زندگی کی ان تمام غیر مطمئن صورتوں کے باوجود اس میں ایک خاص کشش اور وقار پاتے تھے۔ انہوں نے ذیل کی کافی میں یہاں کی بود و ماند کا ہو بہو نقشہ کھینچا ہے۔

اوتھ دردمنداں دے ڈیرے　　جتھ کرڑ کنڈا بوئی ڈھیرے

ترجمہ:۔ اس ریگستان میں جہاں کریر کے درخت اور خاردار جھاڑیاں اور بوئیں (ریگستانی بوٹی) پیدا ہوتے ہیں۔ دردمندوں کی قیام گاہیں ہیں۔

کھپ کھاراں تے لئی لانڑیں　　سنٹھ پھوگ بہوں من بھانڑیں

تھل ٹبے ڈہر ٹکانڑیں　　ہر بھٹ بھٹ نال بسیرے

Scanned with CamScanner

ترجمہ: کھپ، بجی، جھاؤ، سنھ اور پھوگ (ریگستانی گھاس اور پودے) دل کو بہت بھاتے ہیں۔ تھل میں، ٹبوں میں، ڈھیروں میں اور ہر فرازی کے موقعہ پر ہمارے رین بسیرے ہیں۔

ولھ ککڑیاں ریھڑ کچریاں　　کئی سبز متیرے کھکڑیاں
کئی گدریاں، پیلیاں ککڑیاں　　سر روہی سوہندے سہرے

ترجمہ: ریگستان کی بیلوں میں رنگ برنگ کی کچریاں۔ ریھڑ (خربوزے کی قسم) لگے ہیں۔ کہیں سبز متیرے (تربوز کی قسم) اور ککڑیاں ہیں۔ ان میں کئی ملگجی ہیں۔ کئی زرد اور سرخی آمیز ہیں۔ ان تمام خوبصورت مناظر کا ریگستان کے سر پر سہرا ہے

خوش قطرن عطروں بھنڑی　　گز لائی ساوی سنڑی
کھا ساگ پوسی دی پھنڑی　　بنھ ویندے قدم سکھیرے

ترجمہ: ریگستان کے تحائف۔ عطر بیز خوشبودار جسن، خس کے عطر میں بسے ہوئے جھاؤ اور لائی کے علاوہ سبز سنہری گھاس ہے۔ پوسی (ریگستانی بوٹی کا پھول اور پھنڑی کا ساگ کھا کر اچھا وقت گذر جاتا ہے۔

دل ہر ویلے پئی تانگھے　　دنج ڈیکھاں مال دے لانگھے
گئیں بکریاں بھیڑاں چانگھے　　لنگھ پوندم قدم اگیرے

ترجمہ: دل ہر وقت مویشیوں کی راہ دیکھنے کو بیتاب رہتا ہے۔ گائیں بکریاں اور بھیڑوں کے گلے دیکھنے کے لئے قدم آگے بڑھتے ہیں۔

سو لکھ کنڈے کاٹھیاں　　لکھ ڈونگرا ویکھاں گھاٹیاں
سب ڈنگڑے وٹڑے چاٹیاں　　جتھ تھیوم فریدؔ وہیرے

Scanned with CamScanner

ترجمہ :- سینکڑوں کنکر - کانٹے اور لکڑیاں - لاکھوں نشیب و فراز کے دشوار گذار راستے ان گذرگاہوں میں فرید کے پاؤں میں ٹیڑھے اور نوکیلے پتھر چبھتے ہیں۔

بہاولپور کے اس ریگستان میں تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں چٹیل میدان ہیں تو وہ اپنی اصل حالت میں جھاڑیاں اور پودے ہیں تو وہ خود رو انسان ہیں تو ان میں سراسر خلوص عورتیں غازہ اور سرخی سے بے نیاز۔ اور مرد ظاہری ٹیپ ٹاپ سے مرتفع ایک شاعر اس فطری حسن کو دیکھ کر کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ خواجہ غلام فرید ایک تو ویسے ہی قدرتی مناظر کے شیدائی اور زندگی کی ان قدروں کے دلدادہ تھے جن پر نئے زمانے کی چھاپ نہیں لگی۔ پھر اس پر روہی سے ان کو جو روحانی نسبت اور قلبی وابستگی تھی اس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تمام کلام روہی کے ذکر سے مزین ہے۔ ہجر و وصال کی کیفیت ہو یا بہار و خزاں کے مناظر۔ ان میں جب تک روہی کا سوز و ساز شامل نہ ہو بات ہی نہیں بنتی۔

خواجہ صاحب نے اپنی مختلف کافیوں میں روہی کی برسات اور اس کے پُربہار مناظر کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ کافیاں منظر کشی کے اعتبار سے ملتانی ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ ایک کافی کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

روہی رنگ رنگیلی چک کھپ ہار جمیلاں پاوے
بوٹے بوٹے گھنڈ سہاگوں گیت پرم دے گاوے

Scanned with CamScanner

(۱۱)

خواجہ غلام فریدؒ

کیسر بھنڑی ہولی چنڑی — ول ول مینہ پوسا دے
پورب باڑ ڈکھن دے بادل — کوئی آوے کوئی جاوے

سانوٹ مینگھ ملہاراں — سبھوں تھلڑیں مال نہ ماوے
پیسوں پانی دھارو دھاری — ڈیسوں جھوک ترا دے

چکا اور کھپ (ریگستانی بوٹیوں کے نام ہیں) بارش کے چھینٹوں سے جب ان میں چھوٹے چھوٹے سرخ پھول نکل آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے گلے میں سونے کے ہار پڑے ہوتے ہیں۔ بوٹوں کا سہاگ کے گھونگٹ نکال کر محبت کے گیت گانا۔ بادلوں کے تواتر سے ریگستانی دوشیزاؤں کے دوپٹوں کا جو ریگستانی بوٹیوں کی زعفرانی خوشبو میں بسے ہوتے ہیں بار بار بھیگ جانا، موسم کے موسیقی افزا اثرات کی وجہ سے مال مویشی کا چاروں طرف جمع ہو جانا اور ایسے وقت چولستانیوں کا یہ خواہش کرنا کہ اب وہ خوب سیر ہو کر پانی پئیں گے اور اپنی آبادیوں کو بھی سیراب کریں گے۔ روہی کی زندگی کے ایسے واقعاتی پہلو ہیں جن کا لطف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

پیلو اور ڈیلھے چولستان کے خاص میوے ہیں۔ یہ کریہہ اور جال کے درختوں پر موسم بہار میں آتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے انہیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ جب یہ پھل پک جاتے ہیں تو ان کے رنگوں سے تمام

Scanned with CamScanner

صحرا رنگین دکھائی دیتا ہے۔ عورتیں باریک تیلیوں کی بنی ہوئی ٹوکریاں گلے میں ڈال کر پیلو چنتی ہیں اور ایک طرف ان کی ڈھیریاں بناتی جاتی ہیں۔ اس کے بعد انہیں ٹوکریوں میں بھر بھر کر بازار میں فروخت کرنے کے لئے لے جاتی ہیں شہری لوگ انہیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں وہ غلہ دے کر چولستانی عورتوں سے پیلو اور ڈیلھے خرید لیتے ہیں۔ اس تمام واقعہ کو خواجہ صاحب نے ذیل کی کافی میں پیش کیا ہے۔ اہل تصوف اسے عارفانہ کلام بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے ریگستان سے صحرائے عرب مراد لی ہے اور پیلو کے پھل سے ثمر اسلام کی تلمیحات کو آخر تک نبھایا ہے۔ اگر اس تاویل کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو تو بھی اس کی ادبی منزلت میں کمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ منظر کشی اور حقیقت نگاری کے اعتبار سے یہ کافی لاکھوں شعروں پر بھاری ہے۔ یہاں پوری کی پوری کافی بمعہ ترجمہ نقل کی جا رہی ہے تاکہ اس بیان کی صداقت واضح ہو سکے

آ چنوں رل یار
پیلوں پکیاں نی وے

کئی بگڑیاں کئی ساویاں پیلیاں
کئی بھوریاں کئی پھکڑیاں نیلیاں
کئی اودیاں گلنار
کٹوریاں رتیاں نی وے

پار تھئی ہے رشک ارم دی
سک سڑ گئی جڑھ دکھ تے غم دی
ہر جا باغ بہار
ساکھاں چکھیاں نی وے

Scanned with CamScanner

30
(ii)

خواجہ غلام فریدؒ

پیوں ڈیلھاں ندیاں گلزاراں
کئی لا بیٹھیاں بار

کہیں گل ٹوریاں کہیں سر کھاریاں
بھر بھر پچھیاں نی وے

جاں جلوئیں تھئی آبادی
لوکی سہنس ہزار

پل پل خوشیاں دم دم شادی
کل نے پھکیاں نی وے

حوراں پریاں ٹولے ٹولے
راتیں ٹھڈیاں ٹھار

حسن دیاں ہیلیاں برہوں دے جھولے
گرنایں تتیاں نی وے

رکھ دے ناز حسن پر ور دے
تیز تکھے ہتھیار

ابرو تیغ تے تیر نظر دے
دلیاں پھٹیاں نی وے

کئی ڈیون ان نال برابر
کئی ویچن بازار

کئی گھن آون ڈیڈھے کر کر
تلیاں تکیاں نی وے

کئی دھپ وچ دی چندیاں ہندیاں
کئی چن چن پیاں ہار

کئی گھن چھان چھنوریے پہندیاں
ہڈیاں تھکیاں نی وے

ایڈوں عشوے غمزے نخرے
اوڈوں یار خرائتی بکرے

Scanned with CamScanner

31/(ii)

کسن کان تیار — روہی اور خواجہ غلام فریدؒ
راناں رسیاں نی وے

پیلوں چنڑیں بوچھن لیراں — چولا وی تھیا لیر کتیراں
گھڑے کرن پچار — سینگیاں سکیاں نی وے

آیاں پیلوں چنن دے سانگے — اوڑک تھیاں فریدن وانگے
چھوڑ آرام قرار — ہکیاں بکیاں نی وے

* پیلو پک گئے ہیں اے دوست۔ آ مل کر انہیں چنیں۔ سبز سرخ۔ زرد نیلے اودے اور گلناری رنگ کے پیلوؤں سے سارا صحرا رنگین ہو گیا ہے ریگستان نمونہ بہشت بنا ہوا ہے۔ دکھ اور غم کی جڑیں سوکھ گئی ہیں۔ ہر جگہ باغ و بہار کا سا لطف ہے۔ اے دوست تو نے بھی یہ میوہ کھا کر دیکھا۔ پیلو چننے والے طرح طرح سے پھل چن رہے ہیں بعض کے گلے میں ٹوکریاں ہیں اور بعض کے سروں پر چھابڑی ہے۔ بعض نے ٹوکریاں بھر بھر کر ڈھیر لگا لیا ہے۔ پیلو کی بہار کی وجہ سے صحرا میں ہر چھوٹے بڑے جال کے درخت کے نیچے انسانی ہجوم اور آبادی کا منظر ہے۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ جمع ہیں اور خوش و خرم ہیں۔ اور جگہ جگہ انہوں نے جھونپڑیاں ڈال کر بستیاں آباد کر رکھی ہیں۔ یہ سب لوگ پیلو چننے کی خاطر جنگل میں منگل منا رہے ہیں۔ حسینانِ عالم حوروں اور پریوں کی طرح ٹولیاں بنا کر محوِ خرام ہیں۔ بادِ نسیم ان کے حسن سے متاثر ہو کر چل رہی ہے اور محبت

Scanned with CamScanner

کی پُرجوش ہوا میدان میں پھیلی ہوئی ہے۔ موسم پر اس کا جاں پرور اثر ہو گیا ہے اور راتیں ٹھنڈی ہیں۔ یہ نازنین، حسن و نزاکت کے پتلے۔ ابرو کی تلواریں اور نگاہوں کے تیر ایسے تیز ہتھیار رکھتے ہیں کہ دلوں کو ایک ہی نظر میں زخمی کر دیتے ہیں۔ یہ نازنینائیں جب پیلو چن کر بازار میں فروخت کرنے کے لئے لاتی ہیں۔ تو ان کی قیمت کا اندازہ بھی مختلف ہوتا ہے کچھ تو غلہ کے ہم وزن پیلو دیتی ہیں کچھ ڈیوڑھی شرح پر فروخت کرتی ہیں اور جن کے گاہک صحرا میں نہیں پہنچ سکتے وہ بازار میں تول کر بیچتی ہیں۔ کچھ حسینائیں تو دھوپ میں بھی پیلو چننے کا شغل جاری رکھتی ہیں اور کچھ سایہ میں بیٹھ کر دھوپ سے بچی رہتی ہیں زیادہ تاب مشقت نہ لانیوالی چن چن کر بیحال ہو گئی ہیں۔ پیلو چننے والی نازنیناؤں کی طرف سے عشوؤں غمزوں اور نخروں کی فوج تیار ہے اور ہلّہ بولنے پر آمادہ ہے اور دوسری طرف عشاق خیراتی بکروں کی طرح ذبح ہونے کیلئے موجود ہیں یہی دل کش کھیل رچا ہوا ہے۔ حسین دوشیزائیں پیلو چننے میں اس قدر محو ہیں کہ انہیں دوپٹے اور چولے کا بھی ہوش نہیں رہا۔ دوپٹوں کی دھجیاں لگ گئی ہیں اور چولے پھٹ کر تار تار ہو گئے ہیں۔ ہمجولیاں اس حالت کو دیکھ کر ان کو نام دھرتی ہیں۔ پیلو چننے کے لئے آئی تھیں مگر فرید کی طرح بے خود ہو گئیں اور آرام و قرار چھوڑ کر ہکا بکا ہیں۔"

روہی اپنے قدرتی مناظر کے اعتبار سے ہی دل کش نہیں۔ اس کے مکینوں کا خداداد حسن اور ان کے ناز و ادا بھی اہل دل کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں یہاں کی عورتیں حسین نقش و نگار کی مالک ہوتی ہیں۔ ان کے جسم پر سرخ تاگوں سے بنی ہوئی چولی اور رنگ برنگے لہنگے بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بارے

Scanned with CamScanner

(۱۱)

میں خواجہ صاحب کی رائے ملاحظہ ہو۔

روہی از خواجہ غلام فریدؒ

وچ روہی دے رہندیاں — نازک ناز و جٹیاں
راتیں کرن شکار دلیندے — ڈیہاں و لوڑن مٹیاں
گجڑے تیر چلاون کاری — سے سے دلڑیاں پھٹیاں
کر کر دردمنداں کوں زخمی — ہے ہے بدھن نہ پٹیاں
چھیڑن بھیڈاں بکریاں گائیں — لیلے گابے کٹیاں
کئی مسکین مسافر پھاتھے — چوڑ کتو نے ترٹیاں
دھوئیں دار فقیر تھیوسے — فخر وڈائیاں سٹیاں

"روہی میں نازک و خوش ادا جٹیاں رہتی ہیں۔ رات کو دلوں کے شکار کرتی ہیں اور دن کو اپنے حسب معمول مشغلے میں مصروف رہتی ہیں اور چھاچھ کے مٹکے بلوتی ہیں یہ حسینائیں چھپ چھپ کر نگاہِ ناز کے تیر چلاتی ہیں اور سینکڑوں دلوں کو چھیدتی ہیں۔ یہ بے پروا معشوق دردمندوں کو زخمی کر کے مرہم بھی نہیں لگاتیں۔ یہ ناز و انداز والی حسینائیں مال مویشی چراتی ہیں اور بھولے بھٹکے مسافروں کو اپنے عشق کے جال میں پھنسا لیتی ہیں۔ ہم بھی انہیں مست ناز محبوبوں کی محبت میں پھنس کر دھونی رمانے والے فقیر بن بیٹھے ہیں اور تمام بڑائی اور فخر ترک کر دیا ہے"

خواجہ صاحب کی یہ کافی ان کے روہی والے رومان کے ثبوت کے طور پر بھی پیش کی جا سکتی ہے بالخصوص ان کا یہ شعر کہ ہم بھی انہیں مست ناز محبوبوں کی محبت میں پھنس کر دھونی رمانے والے فقیر بن بیٹھے ہیں اور تمام بڑائی اور فخر ترک کر دیا ہے۔ روہی سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کے راز کو ظاہر

Scanned with CamScanner

دینے کے لیے کافی ہے

خواجہ صاحب کی نظر سے روہی کا کوئی گوشہ نہیں بچا تھا۔ انہوں نے ایک سچے عاشق کی حیثیت سے روہی کا چپہ چپہ چھانا تھا۔ یہاں بہار کے دن بھی گذارے تھے۔ اور خزاں کی سوختہ سامانیاں بھی دیکھی تھیں۔ روہی جہاں بہار کے دنوں میں ایک بہشت ارضی کا نمونہ ہوتی ہے۔ وہاں خشک سالی کے دنوں میں ایک ہیبت ناک جنگل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس وقت دن دہاڑے یہاں سے گذرنا مشکل ہوتا ہے۔ طرح طرح کے جانور اپنی وحشت ناک آوازوں سے دل دہلا رہے ہوتے ہیں۔ ٹڈے۔ فاختائیں۔ گوہیں۔ لومڑی اور سانپ سے لے کر لگڑ بگڑ تک یہاں ملتے ہیں۔ لگڑ بگڑ کے بارے میں یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ اس کی پیٹھ پر ڈائن سوار ہوتی ہے اور اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ بندوق کی نالی کو دانتوں میں دبا کر چبا جاتی ہے۔ اس پر ہول منظر کو خواجہ صاحب نے جنگلی جانوروں کی آواز کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے۔

تڈرے چکین، گیرے گھوکن — جرکھاں ترکھاں لونبڑ کوکن
گوہیں شوکن، سانھے پھوکن — نانگیں دی شوں شوں ہے یار

ترجمہ:۔ جھینگر چیخ رہے ہیں۔ فاختائیں ہُو کا نعرہ لگا رہی ہیں۔ لگڑ بگڑ لومڑیاں گوہیں۔ سانھے اور سانپ طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں۔

ریگستان کی ان ہولناکیوں کو دیکھ کر کس کی ہمت ہے کہ ادھر کا رُخ کرے۔ ہاں یہاں کے رہنے والے جنہیں اس جگہ سے قدرتی لگاؤ ہے۔

Scanned with CamScanner

یا وہ عاشقانِ استقامت یا جن کے دل حسنِ صحرا کے جلوؤں سے منور ہیں یہاں کی بادیہ پیمائی کی جرأت کر سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب پر موخرالذکر بات صادق آتی ہے۔ انہوں نے ایک عاشق صادق کی طرح روہی کا سفر اختیار کیا۔ مدتوں وہاں رہے اور وہاں کے ہر گوشۂ حیات کا عمیق مطالعہ کیا۔ ان کے کلام میں اس علاقے کی جو نمائندہ خصوصیات نظر آتی ہیں وہ ان کی اسی ریاضت اور دقتِ نظر کا نتیجہ ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہ خواجہ صاحب کا اس علاقے پر احسان ہے کہ انہوں نے اس فراموش کردہ زمین کو اپنے کلام میں جگہ دے کر شہرت دوام بخش دی۔ آج جن لوگوں کی زبان پر خواجہ غلام فرید کا کلام ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ دنیا میں ایک سرزمین ایسی بھی ہے جسے روہی کہتے ہیں اور جو اپنی بے سرو سامانی کے باوجود اپنے میں کچھ ایسی جاذبیت اور کشش رکھتی ہے کہ شاعر کا حقیقت نگار قلم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

Scanned with CamScanner

فریدؒ اور روہی

مہر محمد اسلم ایم اے

حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ نے ریگی زبان اور اس علاقے کی تہذیب و تمدن جو احسان کیا ہے وہ ہمارے لئے سرمایۂ فخر ہے۔ آپ کی شاعری نازک شاعری ہے۔ جذبات کی سچی ترجمانی۔ منظر نگاری۔ کائنات کا بھرپور مطالعہ۔ منزہ، بلند اور اتھاہ خیالات۔ سلیس اور مستند زبان۔ دلکشی اور انتخاب الفاظ آپ کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بدولت آپ کی شاعری زندہ جاوید ہو گئی ہے۔ آپ کی بدولت ریگی زبان کا مرتبہ دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بہت بلند ہو گیا ہے۔ آپ جس منظر کی تصویر کھینچتے ہیں وہ قاری کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جاتا ہے۔ آپ جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ نگینے کی طرح جڑا ہوتا ہے۔ آپ جس ماحول پر نظر ڈالتے ہیں اسے حیات جاوید بخش دیتے ہیں۔ چنانچہ روہی چولستان جیسے وحشت خیز ویرانے اور بے رحم دقی ریگزار کی طرف توجہ فرمائی تو اسے سراپا حسن کر دیا۔ اس کی ویرانیوں میں رعنائیاں بھر دیں۔ اس کی وحشتوں کو شانِ دلربائی بخشی اس کا روح فرسا تنہائیوں میں وہ رنگ بھرا کہ بزمِ جمشید رشک کرے۔ اس کی ازلی و ابدی خاموشی کو ادائے حکیمی عطا کی۔ یہ خواجہ صاحب کی نظر کا اعجاز ہے کہ اس کا ایک ایک نقش یوں اجاگر ہو گیا ہے کہ اہلِ دل کو روہی ہمیشہ دعوتِ نظارہ دیتی رہے گی۔

روہی یا چولستان اس دشت و بیابان کا نام ہے جو تھرپارکر، بیکانیر، جیسلمیر اور صحرائے راجپوتانہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ علاقہ وسیع و عریض بھیانک ریگستان کا سلسلہ ہے جس میں عجیب وحشت برستی ہے۔ جس میں ایک عظیم اور پر وقار سکوت صدیوں سے اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے۔ جس میں کبھی کبھی غوری اور غزنوی کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے عارضی ارتعاش پیدا کیا۔

روہی میں ایک ایسی خاموشی ہے جو روح سے براہِ راست ہم کلام ہوتی ہے